Oriental College Magazine, Vol.101, No. 03, Serial No. 381, 2025

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی کالم نگاری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

ذیشان تبسّم، پی ایچ ڈی
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو و اقبالیات، دی اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور

Critical Study of Khwaja Zakaria's Columns

Zeeshan Tabassum, PhD
Assistant Professor of Urdu
The Islamia University, Bahawalpur

Abstract

Dr. Khwaja Muhammad Zakaria is an all-round literary personality. He is an authoritative researcher, critic, and stylistic poet of Urdu language and literature. While he made inroads into other genres of literature, he also continued to write columns for the daily Nawa-e-Waqt under the title "Zouq- o Shoq". The life of a column, which is now considered an important part of Urdu journalism, is usually of one day's duration, but a large part of the topics that Khwaja Zakaria raised with this pen are of permanent importance. He has gone beyond temporary fame and personal interests and has presented the essence of his life experiences in these columns with all sincerity. He has also written a few columns on political topics, but the subject of most of the columns has been literature, literary figures, books and literary events. These are the topics that he has written and read and taught throughout his life, therefore these writings are completely free from superficiality. The style of his columns has taken on a literary elegance that has saved them from being cumbersome and dry. Khwaja Zakaria is also a master of language and an educationist, and his opinions in this regard are very authoritative. An important topic of Khwaja Zakaria's columns is Pakistan. He has adorned the story of the rise and fall of Pakistan in the way he has adorned his columns. This is his specialty. He has a deep awareness of his surroundings and society, and through these columns he has emerged as a social critic in the truest sense.

Keywords:
Khwaja Muhammad Zakaria, literary personality, Pakistan, columns, Nawa-e-Waqt, Zouq- o Shoq

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، اُردو زبان و ادب میں اپنے علمی تشخص اور تہذیبی و تخلیقی کارناموں کی وجہ سے منفرد و ممتاز مانے جاتے ہیں۔ تحقیق و تدوین، تنقید و شرح، ادبی تاریخ نویسی، شخصیت نگاری، مصاحبہ کاری کے علاوہ بہ طور شاعر اور ماہر تعلیم کے اُن کی خدمات کی ایک دنیا معترف ہے۔ حالی و اکبر اور اقبال و مجید امجد شناسی آپ کے اختصاصی حوالے ہیں۔ اورینٹل کالج جیسے تاریخی ادارے میں آپ کے علم و فضل کی دھوم رہی ہے، جب کہ چین و جاپان اور دنیا جہان کے اردو زبان و ادب سے وابستہ طلبہ آپ کے تلامذہ میں شامل ہیں۔ خواجہ محمد زکریا کی متنوّع علمی و ادبی جہات میں سے ایک ان کی کالم نگاری بھی ہے۔ انھوں نے کالم نگاری کا سلسلہ اپنے ایک " عزیز ترین شاگرد اور دوست ڈاکٹر عاطف خالد بٹ "(۱) کی فرمائش پر شروع کیا، جو معروف اردو اخبار "نوائے وقت " سے منسلک ہیں۔ علامہ اقبال کے دوسرے اردو شعری مجموعے "بالِ جبریل" میں ایک معروف نعتیہ نظم "ذوق و شوق" کے عنوان سے شامل ہے، خواجہ صاحب نے اپنے مزاج اور اقبال سے عقیدت کی وجہ سے اپنے کالم کے لیے "ذوق و شوق" کا مستقل عنوان منتخب کیا۔ ان کا کالم ہفتے میں ایک دن روز نامہ "نوائے وقت" کے ادارتی صفحہ پر بہ روز اتوار شائع ہوتا رہا۔ کالم نگاری کے اس سلسلے کا آغاز ۲۷ جون ۲۰۲۱ء کو ہوا، اور قریب اڑھائی سال خواجہ زکریا کے اس "ذوق و شوق" کا سفر باقاعدگی سے جاری رہا۔ اس دورانیے میں انھوں نے جو کالم لکھے ان کی تعداد ستتر بنتی ہے۔ دریں اثناء محض چار مرتبہ (۲۳ جنوری ۲۰۲۲ء، ۳۱ اپریل ۲۰۲۲ء، ۹ اکتوبر ۲۰۲۲ء، ۲۵ دسمبر ۲۰۲۲ء) ان کے اس ہفتہ وار کالم کا ناغہ ہوا، جب کہ دو مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ کالم اتوار کی بہ جائے پیر (۲ مئی ۲۰۱۲ء) اور بدھ (۱۱ مئی ۲۰۲۲ء) کے دنوں میں شائع ہوا، باقی دورانیے میں یہ ہر اتوار کے روز ادارتی صفحہ کے نمایاں مقام پر چھپتا رہا۔ خواجہ زکریا کے یہ کالم معروف اشاعتی ادارے الحمد پبلی کیشنز، لاہور کے زیرِ اہتمام ۲۰۲۴ء میں کتابی صورت میں مرتّب ہو کر منصّہ شہود پر آ گئے ہیں۔ اس مجموعے کے لیے خواجہ صاحب نے "کہتا ہوں سچ" کا عنوان منتخب کیا ہے جو ان مزاج اور کتابِ حیات کی درست عکاسی کرتا ہے۔ "نوائے وقت" میں خواجہ زکریا کے ستتر کالم شائع ہوئے تھے، "کہتا ہوں سچ" میں ان کی تعداد چوہتر ہے۔ وہ تین کالم جو بوجوہ شمولیت حاصل نہیں کر سکے ان کے عنوانات ہیں: ۱۔ طارق محمود کا حلقہ دام خیال (۱۷ جولائی ۲۰۲۲ء) ۲۔ میں نے پاکستان بنتے دیکھا (یکم اگست ۲۰۲۲ء)، ۳۔ اورینٹل کالج کی بعض نام ور شخصیات (۲۴ اپریل ۲۰۲۲ء)۔

"کہتا ہوں سچ" میں شامل کم و بیش تمام کالمز زمانی ترتیب سے پیش کئے گئے ہیں۔ "نوائے وقت" میں شائع ہونے والے پہلے کالم کا عنوان تھا: "صادق جذبوں طیب رزقوں والے"۔ اس میں خواجہ زکریا نے

اپنی کالم نگاری کے عمومی مزاج، موضوعاتی دائرہ کار اور ترجیحات کے حوالے سے ایک نقطۂ نظر ان الفاظ میں بیان کیا:

> "اس ہفتہ وار کالم میں میری کوشش یہ ہو گی کہ زیادہ توجہ ادبی اور تعلیمی نکات کی طرف مبذول کراؤں جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ میں تقریباً ساٹھ سال سے بچوں کو شعر و ادب کی تعلیم دے رہا ہوں۔ اس طویل عرصے میں جو کچھ سیکھا اور سکھایا ان تجربات میں اپنے عزیز قارئین کو بھی شریک کروں۔۔۔ میں کوشش کروں گا کہ اپنی تحریر میں زیادہ جذباتیت سے انحراف کروں اور مبالغہ آمیزی سے اجتناب کروں لیکن اپنا نقطۂ نظر پوری دیانت داری سے آپ تک پہنچاؤں۔ میں ادب اور تعلیم کے علاوہ حسبِ ضرورت دیگر سیاسی، سماجی اور ثقافتی مسائل کی طرف بھی اشارے کروں گا تا کہ "شوقِ فراواں" کی حامل ہماری قوم باذوق مشاہیر اور ان کے خیالات و نظریات سے آگاہی حاصل کر سکے۔"(۲)

خواجہ زکریا کا آخری کالم جو "نوائے وقت" کی زینت بنا "اکبر الہ آبادی: ہمارے قومی امراض کے نباض (قسط ۳)" تھا، جو ۸ جنوری ۲۰۲۳ء کو شائع ہوا۔ اس کے بعد خواجہ زکریا نے یہ سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس انقطاع کے دو بنیادی اسباب تھے۔ "نوائے وقت" کے ایک کالم نگار کرنل (ر) سکندر بلوچ تھے، انھوں نے ایک کالم میں فوج کے ادارے پہ تنقید کی، اس کی اشاعت کے بعد اخبار انتظامیہ کی سرزنش ہوئی اور اس نے سکندر بلوچ کو بین کر دیا۔ دریں اثناء ادارہ اس درجہ محتاط ہوا کہ انھوں نے خواجہ زکریا کے ارسال کردہ ایک کالم کا نصف حصّہ کاٹ دیا جس سے ان کی حساس طبیعت کو ٹھیس لگی اور انھوں نے لکھنا چھوڑ دیا۔ ممکن ہے اس بدمزگی کا کچھ تدارک ہو جاتا مگر اس دورانیے میں خواجہ صاحب کی طبیعت سخت ناساز ہو گئی، جس نے رہی سہی کسر پوری کر دی، اس کے بعد یہ سلسلہ پھر کبھی شروع نہیں ہو سکا۔

معروف ادبی شخصیت کشور ناہید نے کہیں لکھا تھا کہ "ایک ادیب کا کالم ہی ادب ہوتا ہے۔" خواجہ زکریا کے کالمز بھی اس اصول پر پورا اترتے ہیں۔ ان کے بیشتر کالمز کے موضوعات بھی ادبی نوعیت کے ہیں جن میں انھوں نے اردو زبان کی اہمیت و ضرورت، ادبی شخصیات و کتب اور تحریکات و رجحانات کو موضوع بنایا ہے تاہم بعض کالمز میں تعلیم و تدریس، تہذیب و ثقافت اور سیاست و معاشرت جیسے موضوعات پر بھی اپنے رشحاتِ فکر کا اظہار کیا ہے۔

ایسے کالمز جن میں پاکستان کی سیاست کو موضوع بنایا گیا ہے وہ محض آٹھ ہیں، ان میں بھی عصری

سیاست سے زیادہ تحریک و تاریخ پاکستان کو موضوع بنایا گیا ہے۔ خواجہ زکریا پاکستان کی آمرانہ حکومتوں کے شدید خلاف رہے ہیں، انھوں نے ایوب خان سے پرویز مشرف تک سب فوجی حکومتوں پہ سخت تنقید کی ہے اور انھیں جملہ خرابیوں کا ذمہ دار قرار دیا ہے مگر وہ جمہوری حکومتوں اور سیاسی قیادت سے بھی خوش نہیں، سچی بات تو یہ ہے کہ پاکستان میں حکومت سازی کا پورا ڈھانچہ زوال پذیر ہے اور اس کی اصلاح اس لیے ممکن نہیں کہ مقتدر طبقے کی نیّتوں میں فتور ہے۔

خواجہ زکریا پاکستانی سیاست کو بہت قریب سے سمجھتے ہیں۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ اور قومی زوال کے اسباب پہ ان کی گہری نظر ہے۔ وہ اپنے کالمز اور دیگر تحاریر و تقاریر میں زوال کا پس منظر بیان کرتے رہتے ہیں۔ حکمرانوں کی عاقبت نااندیشی، ہوسِ اقتدار اور رشوت ستانی کے وہ شدید ناقد ہیں۔ ان کے اپنے خاندان میں بااثر سیاست دان موجود رہے ہیں اس لیے وہ ان کے مزاج، کھوکھلے نعروں اور حیلہ سازی سے بہ خوبی واقف ہیں۔ انھوں نے بہت کم سیاسی کالم لکھے ہیں تاہم ملکی حالات کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے قلبی جذبات کا اظہار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اپنے کالم "روم جل رہا ہے" میں وہ پاکستان کے قیام کے پس منظر اور اس سے وابستہ توقعات کا ذکر کرتے ہوئے اس کے نمایاں ادوار اور زوال کے محرکات و نتائج پہ روشنی ڈالتے جاتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر جمہوریت پسند ہیں اس لیے ہر آمر پر تنقید کرتے ہیں مگر جمہوری حکمرانوں سے بھی وہ سخت ناخوش ہیں۔ اسی لیے ان پہ تنقید بھی وہ فرض سمجھ کے کرتے ہیں۔ یہی کام انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے کیا ہے۔ ان کے سیاسی کالمز دردِ دل سے بھرپور اور ان کے قلبی جذبات کا اظہار ہیں۔ وہ ایک محبِ وطن پاکستانی ہیں اور اسی پاکستان میں جب وہ روز بروز بڑھتی خرابیاں دیکھتے ہیں تو ان کا دل کڑھتا ہے اور ایک مخلص اور دردِ دل رکھنے والی ادبی شخصیت کی طرح وہ درپیش مسائل کی نشان دہی بھی کرتے ہیں، اس کے ذمہ داران کی گرفت بھی کرتے ہیں اور بساط بھر مشورے بھی دیتے ہیں۔ حکمرانوں کے کردار سے بسا اوقات خواجہ صاحب اس درجہ دل گرفتہ ہو جاتے ہیں کہ ان کا قلم ایسے جملے لکھنے پہ مجبور محسوس ہوتا ہے: "شاید ہمارے اربابِ اختیار دل سے مسلمان ہیں نہ محبِ وطن۔"

خواجہ زکریا نے جن ادبی شخصیات کے فکری مطالعات کیے، ان کے توسط سے بھی سیاسی، سماجی، قومی اور ادبی نقطۂ نظر کو واضح کیا۔ علامہ اقبال نے شاعر کو دیدۂ بینائے قوم کہا ہے، خواجہ صاحب جب اس نقطۂ نظر سے اردو شعراء پہ نظر ڈالتے ہیں تو مولانا حالی، اکبر الہ آبادی اور خود اقبال اس معیار پہ پورے اترتے نظر آتے ہیں۔ خواجہ زکریا نے اردو کے جن شعراء کو مستقل بنیادوں پہ اپنی تحریروں کا حصّہ بنائے

رکھا، ان میں اکبر الہ آبادی سرِ فہرست ہیں۔ اکبر واحد شخصیت ہیں جن کے قومی افکار و تصوّرات کے حوالے سے خواجہ صاحب نے ایک سے زائد کالم تحریر کیے ان میں ایک ''اکبر الہ آبادی: ہمارے قومی امراض کے نباض'' ہے جو تین اقساط میں شائع ہوا۔ عنوان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کالم نگار کے نزدیک اکبر کے افکار و تصوّرات کتنی اہمیت رکھتے ہیں، نیز عنوان پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اس کالم کا اصل موضوع ہماری قوم میں رواج پا جانے والی مختلف خرابیوں کی نشان دہی ہے اور کالم نگار نے فکرِ اکبر کی روشنی میں ان عصری مسائل کا حل بتانے کی کوشش کی ہے۔

خواجہ زکریا کے مطابق ہماری قوم کا ایک بڑا مسئلہ اپنے علمی ادبی ورثے سے مایوس کن لاتعلقی ہے۔ اکبر تقلیدِ مغرب کے خلاف ہیں، وہ اپنی روایات اور اقدار کی اہمیت کے قائل ہیں اور انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے مغرب کی بے سوچی سمجھی اور اندھی نقالی کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ انھوں نے مختلف شعری علامتوں کے ذریعے اپنے علمی ادبی ورثے کی طرف متوجہ کیا، اس کی اہمیت کا احساس دلایا، جدید تعلیم یافتہ طبقہ سعدی کی حکمت افروز تعلیمات کے مقابلے میں ملٹن کے خیالات سے مرعوب نظر آتا ہے، مسلمان ماضی میں کاروبار اور ہنر پیشہ ہوتے تھے، مغربی تعلیم یافتہ طبقہ اسے اپنے لیے عار سمجھتا ہے وہ معمولی سرکاری ملازمت کو حاصلِ زندگی مانتا ہے اور اس کے مقابلے میں ہنر سیکھنے یا چھوٹا موٹا کاروبار کر کے باعزت زندگی گزارنے کو معیوب جانتا ہے۔ خواجہ زکریا نے اکبر کے اشعار سے ثابت کیا کہ وہ پڑھے لکھے مسلمانوں کو تجارت کی طرف مائل کرتے نظر آتے ہیں، انھیں تجارت کے فضائل اور اہمیت بتاتے ہیں، ان کے نزدیک تعلیم کا بنیادی مقصد تحقیق اور نئی اشیاء کی ایجاد ہے، محض کتاب خوانی کو وہ تعلیم نہیں مانتے۔ خواجہ صاحب کے مطابق: '' تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ وہ غلط اور صحیح میں امتیاز سکھائے یعنی جانچ پرکھ کر نظریات کو قبول یا رد کرے۔۔۔ لیکن جدید تعلیم نے ہمیں مغرب کی تقلید کے پیچھے لگا دیا، تنقید یا جانچ پرکھ کی بجائے تنقیص یا تحسین کو رواج حاصل ہو گیا۔

اکبر کے حوالے سے ایک عام غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ وہ روایت پرست تھے اور ان کا جامد ذہن نئی اقدار و روایات کو تسلیم کرنے سے قاصر تھا۔ خواجہ صاحب نے اس خام خیالی کی تصحیح کی ہے ان کے مطابق اکبر:

”علماء(مولوی، ملا) اور مسٹر (جدید تعلیم یافتہ) دونوں سے اختلاف رکھتے تھے، مثلاً درسِ نظامی کے بارے میں انھوں نے کئی جگہ طنزیہ انداز اختیار کیا ہے۔عام علماء پر کبھی کبھی ان کی تنقید زیادہ سخت ہو جاتی ہے۔“(۳)

خواجہ صاحب کے مطابق اکبر نے ہمارے جن قومی امراض کی نشان دہی کی ہے ان میں خصوصیت سے خوشامد، منافقت، حسد، لالچ، کاہلی اور بے عملی جیسی خرابیاں نمایاں ہیں۔خواجہ صاحب جو متنِ اکبر کے مستند ترین ماہر ہیں انھوں نے مذکورہ خرابیوں سے متعلق اکبر کے اشعار درج کیے جو بہت مناسب اور موزوں ہیں مثلاً ہمارے مختلف طبقاتِ معاشرہ میں منافقت کا چلن بہت عام ہے اکبر نے اس کم زوری کی جابجانشان دہی کی ہے،خواجہ صاحب کے منتخب اشعار میں سے ایک شعر دیکھیے:

حیرت سے دیکھتا ہوں ہر صاحبِ خرد کو
اس کی زباں کدھر ہے اور اس کا دل کدھر ہے

خوشامد ایک ایسا قومی مرض ہے جو ہر صاحبِ منصب اور خاص طور پر حکمرانوں کو حقیقی صورتِ حال اور اصل مسائل سے دور کر دیتا ہے، وہ اس بد قماش خوشامدی ٹولے کی چکنی چپڑی باتوں کے رسیا ہو جاتے ہیں اور اس فریب کاری کی وجہ سے وہ نہ مسائل کا شعور رکھتے ہیں نہ ان کا تدارک کر پاتے ہیں۔ آج بھی صورتِ حال مختلف نہیں بل کہ جدید ذرائع ابلاغ کی کاروباری ذہنیت، تشہیر سازی کی علت اور لفافہ صحافیوں کی منفعت خوری نے حالات زیادہ ابتر کر دیئے ہیں۔خوشامد کے اس اجتماعی مرض کے حوالے سے خواجہ صاحب نے جن اشعار کا انتخاب کیا ان میں سے ایک ملاحظہ کیجیے:

مجال ہے کوئی کہ دے خوشامدی مجھ کو
اسی لیے تو بہت سہل ہے جناب کی مدح

مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ ریاست کے بنیادی ستون ہوتے ہیں، اکبر نے ان کے کردار کے بارے میں بھی جابجا تنقید کی ہے۔ وہ خود نظام عدل وِ انصاف سے وابستہ تھے اور ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج تک کے منصب پہ فائز ہوئے اس لیے انھیں اس کی کمزوریوں کا براہِ راست تجربہ تھا۔انھیں معلوم تھا کہ یہاں انصاف کے معیارات مختلف ہیں، من چاہے فیصلے کیسے لیے جاتے ہیں اور ان میں تقدیم و تاخیر کیوں کر ہوتی ہے۔اس نکتے کی وضاحت میں کالم نگار نے اکبر کا یہ شعر درج کیا ہے:

پہنچنا داد کو مظلوم کا مشکل ہی ہوتا ہے
کبھی قاضی نہیں ملتے، کبھی قاتل نہیں ملتا

اس کالم کی تیسری اور آخری قسط میں خواجہ زکریا نے سرسید کی تعلیمی پالیسی کا ذکر کیا جس سے اکبر ان کی زندگی میں متفق نہیں تھے مگر بعد میں کانگریسی سیاست اور انتہاپسند ہندو قومیت نے انھیں بھی سرسید کا ہم نوا بنادیا۔

خواجہ زکریا اورینٹل کالج جیسے تاریخی ادارے سے وابستہ رہے اور یہاں انھیں اپنے عہد کے معروف ترین اساتذہ اور علمی و ادبی شخصیات کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ ان میں سے بہت سے اساتذہ ان کے کالمز کا موضوع بنے ہیں جن میں سے چند اہم کالمز کا جائزہ پیشِ خدمت ہے۔

خواجہ محمد زکریا ان محققین اور ناقدین میں شامل ہیں جو ایسی شخصیات اور ان کے کام پہ قلم اٹھاتے ہیں جنھیں ادبی منظر نامے میں نظر انداز ہونے کی وجہ سے جائز مقام نہیں دیا جاتا۔ ایسی ہی ایک شخصیت ڈاکٹر ناظر حسین زیدی کی بھی ہے جو بڑی حد تک گوشۂ گم نامی میں جاچکے تھے۔ خواجہ صاحب نے اپنے کالم ''ڈاکٹر ناظر حسن زیدی: بے مثال حافظے کا مالک'' کے ذریعے انھیں حاشیے سے مرکز میں لانے کی کوشش کی اور ان کی شخصیت اور ان کے علمی کام سے متعارف کرایا۔ ناظر صاحب مرنجاں مرنج اور منکسر المزاج شخصیت کے مالک تھے جو عمر بھر اپنی ذات کو نمایاں کرنے سے مجتنب رہے اسی لیے وہ اردو ناقدین کی توجہ کا مرکز نہیں بن سکے۔ خواجہ صاحب ناظر صاحب کی دل کش شخصیت، ان کی شعر فہمی، باکمال حافظے اور بہ طور مترجم ان کی خدمات کے قدر دان تھے اس کا اعتراف و اظہار اس کالم کے ذریعے ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ شخصیہ، کالم کی شکل میں شائع ہوا مگر اس میں شخصیت نگاری کی بہترین خصوصیات موجود ہیں۔

ڈاکٹر ناظر حسن زیدی، اورینٹل کالج کے نام ور اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ خواجہ زکریا کو ان کی رفاقت میں کام کرنے کا خاصہ وقت ملا۔ انھوں نے جہاں اپنی دوسری تحریروں کے ذریعے اورینٹل کالج کے اساتذہ کا تعارف کرایا وہاں اپنے کالمز میں بھی یہ سلسلہ جاری رکھا۔ وہ بالعموم جس شخصیت پہ قلم اٹھاتے ہیں اس کے مختصر سوانحی کوائف کا ذکر ضرور کرتے ہیں تاکہ نو آموز قارئین بھی مستفید ہو سکیں۔ زیرِ نظر کالم میں بھی خواجہ صاحب نے یہی طریقہ اختیار کیا اور ناظر حسن زیدی کے احوالِ زندگی کا سرسری نقشہ کھینچا جس کے مطابق زیدی صاحب (۱۹۱۷ء۔۲۰۰۶ء) کا تعلق اترپردیش سے تھا۔ وہ دوسری عالمی جنگ میں فوج میں بھرتی ہوئے اور نان کمیشنڈ آفیسر کی حیثیت سے مشرقِ بعید کے ممالک میں کام کرتے رہے، بعد

ازاں حکیم احمد شجاع کے ساتھ پنجاب اسمبلی میں بہ طور مترجم کام کیا۔ دریں اثناء فارسی اور اردو مضامین میں اوپر تلے ایم۔اے کے امتحانات اعزاز کے ساتھ پاس کیے اور کالج سائیڈ پہ لیکچرر مقرر ہو گئے۔ پی ایچ ڈی کے بعد فروری ۱۹۶۳ء میں اورینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی میں بہ طور لیکچرر آ گئے۔ اس وقت تک ان کی چھیالیس سال ہو چکی تھی۔ خواجہ صاحب کی تقرری اس کے چھے ماہ بعد ہوئی، گویا تدریسی سفر کا خاصہ وقت ایک ساتھ طے کیا۔ دریں اثناء ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت نے سرکاری ملازمین کی مدت ملازمت میں اچانک تین سال تخفیف کر دی، اس لیے زیدی صاحب محض تیرہ سال ملازمت کے بعد ۱۹۷۶ء میں ستاون سال کی عمر میں ریٹائر ہو گئے۔ کالم نگار کے مطابق وہ بے حد خود دار، مشرقی شرم و حیا کے پیکر اور شائستہ و وضع دار انسان تھے، اس لیے خاموشی سے اپنے بیٹوں کے پاس امریکا چلے گئے اور باقی عمر وہیں گزار کے ۲۰۰۶ء میں انتقال کر گئے۔ ڈاکٹر ناظر حسن زیدی کی پیکر تراشی ان لفظوں میں کی ہے:

> "دراز قد، بہت متناسب جسم، سانولا رنگ، چہرے کے خط و خال بہت موزوں، انگشت بھر ریش۔۔۔ یوپی کے شرفا کا لباس زیب تن یعنی تنگ مہری کا پاجامہ، تنگ کرتا اور اس پر شیروانی، خواہ کوئی بھی موسم ہو اس میں تبدیلی نہیں آتی۔"(۴)

سوانحی کوائف کے بعد خواجہ زکریا نے زیدی صاحب کے علمی کمالات اور شخصی اوصاف کا بیان کیا ہے۔ ان کے مطابق ناظر زیدی اہلِ زبان تھے اور اردو ان کے گھر کی زبان تھی مگر اس کے علاوہ وہ انگریزی اور فارسی زبانوں کے بھی ماہر تھے۔ ان کا حافظہ بہت مضبوط تھا اور ان سے زیادہ اردو فارسی کے اشعار شاید ہی کسی کو یاد رہے ہوں۔ اس حوالے سے کالم نگار نے ان سے ہونے والے اپنے ایک مکالمے کا ذکر کیا:

> "ایک دفعہ میں نے ان سے اصرار کر کے پوچھا کہ انھیں کتنے شعر یاد ہوں گے تو فرمایا کہ تقریباً پچاس ہزار۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ اگر وہ ایک لاکھ اشعار یاد ہونے کا بھی دعوی کرتے تو قرینِ قیاس ہوتا۔"(۵)

کالم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ناظر صاحب کو مثنویوں کے مکمل ابواب، قصیدے اور پورے پورے مرثیے یاد ہوتے تھے۔ وہ شعر فہم تو تھے مگر ان کا حافظہ اس بلا کا تھا کہ کلاسیکی نثر جیسے باغ وبہار اورآب حیات کے پیرے کے پیرے انھیں ازبر تھے۔

خواجہ صاحب نے ناظر صاحب کی علمی و ادبی خدمات کا بھی اختصار سے ذکر کیا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ

بطور مرتّب ان کا کام اہم ہے تاہم ایک مترجم کی حیثیت سے انھوں نے جو کام کیا وہ اعلیٰ درجے کا ہے مثلاً آرتھر ویگل کی انگریزی کتاب ''قلوپطرہ'' کا ترجمہ بہت دل کش اور رواں ہے۔اسی طرح سبحان رائے بٹالوی کی فارسی کتاب ''خلاصتہ التواریخ'' کا ترجمہ انتہائی شان دار ہے۔خواجہ صاحب کو اس بات کا ملال ہے کہ ہمارے ہاں ایسے تحقیقی ادارے موجود نہیں جو ناظر صاحب جیسے موزوں اہل علم سے تراجم کرائیں تاکہ اردو خواں طبقے کو معیاری تراجم فراہم ہو سکیں۔

ڈاکٹر نذیر احمد جنھیں خواجہ زکریا اپنے کالم'' ڈاکٹر نذیر احمد: جنھیں بھلانا ممکن نہیں'' میں ایک ''ناقابل فراموش شخصیت'' قرار دیتے ہیں، گورنمنٹ کالج لاہور کے معروف پرنسپل رہے ہیں۔خواجہ صاحب کا ان سے ابتدائی تعارف ۱۹۵۴ء میں گورنمنٹ کالج جھنگ میں ہوا جہاں وہ ایف۔اے کے طالب علم اور ڈاکٹر نذیر احمد پرنسپل کالج تھے۔خواجہ زکریا نے موئے قلم سے ڈاکٹر نذیر احمد کی شخصیت کی جو تصویر کشی کی ہے وہ قابلِ دید ہے، ملاحظہ کیجیے:

> ''اوسط درجے کا قد و قامت، چہرے پر مسکراہٹ، رنگ صباحت اور ملاحت کے درمیان، بہت گھنے بال جو بار بار چہرے پر گر جاتے تھے جنھیں وہ ہاتھ سے ہٹاتے رہتے تھے۔موٹے موٹے ہونٹ، لیکن مزاج ایسا خوش گوار تھا کہ لوگ چہرے مہرے پر توجہ دینے کی بجائے عادات و خصائل کے سبب ان سے محبت کرنے لگتے تھے۔۔۔مغربی لباس سے زیادہ مشرقی لباس پہننا پسند کرتے تھے بل کہ بے تکلفی سے نیکر اور ٹی شرٹ پہن کر سائیکل پر کالج آجاتے تھے۔''(۲)

ڈاکٹر سیّد نذیر احمد میں افسرانہ خو بو نہیں تھی، خواجہ زکریا ان کی شخصیت کے اس وصف سے بہت متاثر دکھائی دیتے ہیں کہ وہ ماتحتوں کو یہ احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ ان کے افسر ہیں اور طلبہ کے لیے ہر وقت دست یاب رہتے تھے۔وہ خود بھی ''کومپلیکس فری'' تھے اور یہی عادات ان کے بچوں میں بھی موجود تھیں۔ڈاکٹر نذیر احمد چھے سال گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل رہے، یہاں بھی ان کے مزاج عوامی میں فرق نہیں آیا۔وہ اساتذہ اور طلبہ میں گھل مل کر رہنے کے عادی تھے اور مشاہیر علم و ادب سے ان کے تعلقات بے تکلفی پر مبنی تھے۔خواجہ صاحب نے اس کالم میں نوبیل انعام یافتہ ڈاکٹر عبدالسلام سے اپنی ایک یادگار ملاقات کا بھی ذکر کیا جو ڈاکٹر نذیر احمد کی شفقت سے ان کے گھر پہ ہوئی۔نو آموز طلبہ کی ایسی غیر معمولی حوصلہ افزائی کرنے والا کوئی دوسرا پرنسپل شاید نہ ہو۔

ڈاکٹر سیّد عابد علی عابد، جامع الحیثات شخصیت تھے تاہم خواجہ صاحب کے کالم ''سیّد عابد علی عابد: ایک ٹریجیڈی ہیرو'' کے مطابق ان کی دو حیثیتیں ممتاز تھیں یعنی شاعر اور نقاد۔ ایک وقت تھا جب وہ ہر مشاعرے کی ضرورت سمجھے جاتے تھے تاہم آج وہ اپنی تنقیدی کتابوں کی وجہ سے جانے جاتے ہیں جن میں ''شعر اقبال'' اور ''اصول انتقاد ادبیات'' اہم ترین ہیں۔ خواجہ زکریا اپنی تنقیدی آراء کے معاملے میں بہت صاف گو ہیں، ان کے بیشتر کالم تنقیدی مزاج لیے ہوئے ہیں اور زیرِ تجزیہ کالم میں بھی جہاں وہ عابد علی عابد کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہیں وہاں ان کے کام کا محاکمہ پیش کرتے ہوئے یہ تلخ تبصرہ بھی کر جاتے ہیں:

> '' بہت اعلیٰ تنقیدی کتاب لکھنے کے لیے جس توجہ، محنت اور انہماک کی ضرورت ہے وہ انھیں میسر نہ آسکی۔ زمانہ بڑا بے مہر ہے۔۔۔ جوں جوں وقت گزرتا ہے بہت کچھ رد ہو کر ہمیشہ کے لیے ماضی کی گرد میں چھپ جاتا ہے، لگتا ہے یہی کچھ عابد علی عابد کی بیشتر تحریروں کا مقدر ٹھہرے گا۔''(۷)

خواجہ صاحب کا یہ کالم بھی شخصیت نگاری، تحقیق اور تنقید کا امتزاج ہے۔ خواجہ زکریا نے عابد علی عابد کی زندگی کے عروج و زوال کا عبرت ناک مرقع کمال ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔ وہ شان دار استاد اور بہترین حافظے کے ساتھ خوب صورت شخصیت کے مالک تھے۔ اسی لیے کسی قدر مغرور بھی تھے۔ ایک وقت میں وہ دیال سنگھ کالج کے پرنسپل اور ٹرسٹی بھی تھے، پھر مقدمہ بازی میں ملازمت سے نکالے بھی گئے۔ انھوں نے تین شادیاں کیں پہلی دو ناکام ہوئیں تیسری اہلیہ کو کینسر ہو گیا۔ شراب نوشی کی عادت اختر شیرانی کی صحبت کے وقت سے تھی، ڈپریشن میں مارفین کا استعمال بھی کرنے لگے، اسی علّت کی وجہ سے علیل رہے اور محض ۶۵ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔

ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ، فارسی زبان و ادب کے جیّد عالم، منفرد شاعر اور معروف اقبال شناس تھے۔ ۲۰ اگست ۲۰۲۲ء کو قریب نوّے سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ خواجہ زکریا اور شاہ صاحب مرحوم چند ماہ کے فرق سے اکٹھے اورینٹل کالج میں بہ طور لیکچرر آئے تھے اور یہ تعلق قریب چھے دہائیوں کے تک قائم رہنے کے بعد داعیِ اجل کے طفیل منقطع ہوا۔ ان کے سانحہ ارتحال کے موقع پہ خواجہ صاحب نے ''فارسی زبان و ادب کے ایک عظیم استاد کی رحلت'' کے عنوان سے ایک تعزیتی کالم لکھا، تاہم اس میں جذباتیت سے زیادہ سنبھلا ہوا پیرایہ اظہار اختیار کیا گیا ہے جو خواجہ صاحب کے کالمز کا خاصہ ہے۔ انھوں نے اپنے کالم میں ڈاکٹر سید اکرم شاہ کے مختصر سوانحی کوائف اور نمایاں شخصی اوصاف کے علاوہ ان کی بے پناہ

علمیت، فارسی زبان پہ عالمانہ دست رس، تحقیقی و تدوینی خدمات اور فارسی شاعری کی انفرادیت پہ بے حد عمدہ تحقیقی اشارے کیے۔ خواجہ صاحب نے اس امر پہ اظہارِ افسوس کیا کہ ''نوائے وقت'' کے علاوہ کسی اخبار نے اس سانحہ ارتحال کی خبر تک نہیں لگائی اور اس کی ایک وجہ ان کے نزدیک اخباری عملے میں فارسی سے خوف ناک حد تک عدم دل چسپی بھی ہے۔ موضوع کی رعایت سے کالم نگار نے برصغیر میں فارسی کی شعری روایت اور نثری خدمات پر بھی عمدہ اشارے کیے اور اردو سے وابستہ لوگوں کے لیے اس تہذیبی زبان سے واقفیت کو ضروری قرار دیا۔

اورینٹل کالج سے خواجہ محمد زکریا کا تعلق چھے دہائیوں سے بھی زیادہ عرصے پر محیط ہے۔ انھیں اس ادارے کے بہت سے نام ور اساتذہ سے استفادے اور ان کے ساتھ براہِ راست کام کرنے کا موقع ملا۔ اگر انھیں اس ادارے کا چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا۔ اورینٹل کالج سے وابستہ اساتذہ اور ان کی علمی و ادبی خدمات کا تعارف خواجہ صاحب کی کالم نگاری کا شاید سب سے بڑا موضوع ہے۔ بہت سی شخصیات جو زمانے کی سرد مہری کا شکار ہوئیں یا جنھیں بدلتے تقاضوں نے فراموش کر دیا، ان کے دل کش نقوش خواجہ زکریا کے ان کالمز میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

خواجہ صاحب نے جہاں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر ناظر حسن زیدی، عابد علی عابد وغیرہ کی شخصیات پر مستقل مضامین لکھے وہاں اپنے ایک کالم ''اورینٹل کالج کی بعض نام ور شخصیات'' میں خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع اور علامہ عبدالعزیز میمن جیسے اکابرِ علم و ادب کا ذکر کیا۔ اوّل الذکر خواجہ صاحب کے براہِ راست استاد نہیں تھے تاہم وہ ان کے استاد ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے استاد تھے اور ۱۹۶۳ء میں اپنے انتقال تک وہ پنجاب یونی ورسٹی سے وابستہ رہے، اس لیے خواجہ زکریا کو انھیں دیکھنے اور ان کے کام کے طریقہ کار کو کسی قدر سمجھنے کا موقع ملا۔ مولوی محمد شفیع ہمہ وقت تحقیقی سرگرمیوں میں منہمک رہتے تھے، انھوں نے دن کے سولہ گھنٹے تحقیق کے لیے مختص کیے ہوئے تھے اور کسی صورت میں اس معمول میں تبدیلی نہیں آتی تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد پنجاب یونی ورسٹی نے ان سے مختلف تحقیقی کام کرائے ان میں ایک عظیم کام ''دائرہ معارفِ اسلامیہ'' کی ترتیب و تسوید تھا۔ اس تحقیقی منصوبے کی پہلی جلد مولوی محمد شفیع کی نگرانی میں مکمل ہوئی، باقی تحقیقی کام ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے ہاتھوں ہوا مگر باوجود شگرد ہونے کے خواجہ صاحب صاف گوئی سے لکھتے ہیں: ''خیر مکمل تو ہو گیا مگر وہ معیار نہ رہا۔'' (۸)

خواجہ زکریا نے اپنے کالم میں مولوی محمد شفیع کے کام کرنے کا جو انداز درج کیا ہے وہ آج کے

نوجوان محققین کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”ان دنوں پنجاب یونی ورسٹی کی مرکزی لائبریری اولڈ کیمپس میں تھی جہاں آج کل یونی ورسٹی کا آئی ٹی کالج ہے۔ اس سے ملحق ایک ہموار زمین کا ٹکڑا ہے جو سبزے سے بے نیاز ہے۔ مولوی صاحب وہاں ایک بڑا سا چھاتا لگا کر بیٹھتے تھے۔ بہت مختصر سا سامان، دو کرسیاں اور ایک میز، میز پر کچھ فائلیں اور کچھ حوالے کی کتابیں، اس سے ارد گرد چند مربع گز جگہ پر پردے لگا کر لوگوں کی آمد و رفت کا راستہ مسدود کر رکھا تھا، کسی سے نہیں ملتے تھے۔ وقت طے کیے بغیر تو کسی کے آنے کا سوال ہی نہیں تھا اور کوئی بڑے سے بڑا شخص ملنے آتا تو چائے پانی کا کوئی تکلف گوارا نہ کیا جاتا تھا۔“(۹)

مولوی محمد شفیع کی عام وجہ شہرت ان کی عربی دانی ہے مگر خواجہ زکریا کے اس کالم سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت شستہ انگریزی میں عالمانہ خطاب فرمانے کی قدرت رکھتے تھے اور انھوں نے ایف سی کالج سے ایم اے انگریزی کیا ہوا تھا۔ علامہ عبدلعزیز مومن کا تعلق کراچی سے تھا مگر وہ ایک مرتبہ اپنی جوانی میں مختصر وقت کے لیے اور پھر پچھتر سال کی عمر میں دو سال اورینٹل کالج کے شعبۂ عربی سے وابستہ رہے۔ خواجہ صاحب ان کے تبحر علمی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”علامہ صاحب کے مرتبے کا کوئی عالم شخص برصغیر میں کم ہی پیدا ہوا ہو گا۔ ویسے تو دورِ سرسیّد میں عربی کے بڑے علماء موجود تھے تاہم ان کے علم و فضل کا شہرہ برصغیر تک محدود رہا مگر علامہ میمن کو عربی بولنے والے تمام ممالک میں جانا اور مانا جاتا ہے۔ مجھے عربی کے فاضل حضرات نے بتایا ہے کہ طحہ حسین جیسے علامہ نے اپنی تصانیف میں کئی جگہ علامہ میمن کی کتابوں سے حوالے دیئے ہیں۔“(۱۰)

۲۳مارچ ۲۰۲۲ء کو جن ادبی شخصیات کو ہلالِ امتیاز سے نوازا گیا، ان میں اردو کے معروف شعراء ن م راشد اور مجید امجد بھی شامل تھے جنھیں بعد از وفات اس اعلی سول اعزاز کا مستحق قرار دیا گیا۔ اس تقریبِ پذیرائی کی مناسبت سے خواجہ صاحب نے ایک کالم ”ن م راشد اور مجید امجد کی سرکاری پذیرائی“ کے عنوان سے تحریر کیا۔ خواجہ صاحب کالم کے آغاز میں پہلے ان دونوں شعراء کے مختصر احوالِ زندگی اور ان کے شعری مقام و منصب پہ روشنی ڈالتے ہیں جس سے موازنہ و تقابل کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ مختصراً راشد ان خوش نصیب شعراء میں ہیں جنھیں ان کی زندگی میں بہت پذیرائی ملی اور انھوں نے مجموعی طور پر ایک آسودہ زندگی گزاری جب کہ اس کے برخلاف مجید امجد کی شہرت کا آغاز ان کی وفات کے بعد ہوا اور

انھیں معاشی حوالے سے بھی زیادہ کامیابیاں نہیں ملیں، اسی لیے دونوں کے مزاج میں بھی بعد القطبین کا فرق ہے۔ راشد میں انانیت اور افسرانہ خو بو تھی جب کہ مجید امجد میں درویش منشی اور عاجزی کے عناصر نمایاں تھے۔ن م راشد میں خود کو نمایاں کرنے کی خواہش ملتی ہے جب کہ مجید امجد کم آمیز اور اپنی ذات کی تشہیر سے بے نیاز تھے، راشد کے مقابلے میں امجد صاحب کو ناقدین کا التفات بھی میسر نہیں تھا۔خواجہ زکریا راشد کے معترف ہیں مگر وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ وقت کے ساتھ مجید امجد کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے، اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ ''گزشتہ چالیس برسوں میں ''کلیاتِ راشد'' کے صرف دو ایڈیشن نکلے ہیں جب کہ ''کلیاتِ مجید امجد'' کے دس ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔''(۱۱) راشد اور مجید امجد دونوں مشکل شعراء ہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے ناقدین مشکل نظموں کی آسان شروح لکھیں۔خواجہ زکریا سمجھتے ہیں کہ یہ کام جامعات کے اساتذہ کرسکتے ہیں مگر ان کی عدم توجہی کی وجہ سے وہ زیادہ پر امید دکھائی نہیں دیتے۔

خواجہ صاحب وسیع المطالعہ انسان ہیں، خاص طور پہ اردو کی ادبی کتب کے حوالے سے ان کا مطالعہ حیرت انگیز ہے۔وہ کلاسیکی ادب پہ بھی تسلی بخش نگاہ رکھتے ہیں اور معاصر ادب سے بھی ان کا تعلق مضبوط رہا ہے۔ وہ اپنے کالمز کے ذریعے جہاں قارئین کو ادبی شخصیات سے متعارف کراتے ہیں، وہاں اپنے مطالعے میں آنے والی منتخب ادبی کتب کا تعارف بھی کراتے ہیں۔اس حوالے سے خواجہ صاحب کا ایک اہم کالم معروف فکشن نگار طارق محمود کی خود نوشت ''دامِ خیال'' سے متعلق ہے، جس کے حوالے سے خواجہ صاحب کی رائے ہے کہ تنوّع میں اس کا مقابلہ بہت کم آپ بیتیاں کر سکتی ہیں۔ طارق محمود معروف بیوروکریٹ تھے، انھیں دنیا کے ہر قابلِ ذکر ملک جانے کا موقع ملا اس لیے ان کے تجرباتِ زندگی اور مشاہدات بہت وسیع ہیں، جو ان کی خود نوشت کا امتیازی وصف ہے۔خواجہ صاحب نے اپنے کالم میں اس خود نوشت کا موازنہ قدرت اللہ شہاب کے ''شہاب نامہ'' سے کیا ہے۔وہ شہاب اور ان کی خود نوشت کے مداح ہیں مگر ان کے نزدیک:

> ''طارق محمود کی یہ خود نوشت بعض مقامات پر ''شہاب نامہ'' سے زیادہ متنوّع ہے۔میں خاص طور پر اس کے اس حصّے سے بہت متاثر ہوا ہوں جو انھوں نے افریقہ کے بارے میں لکھا ہے۔۔۔یوں لگتا ہے کہ ہم ان کے ساتھ ساتھ افریقہ کے ہمہ رنگ علاقے کی سیر کر رہے ہیں۔''(۱۲)

خواجہ زکریا کا ایک کالم جس کا عنوان ''بعض کالم نگاروں سے چند گزارشات'' ہے، ۰۶ مارچ

۲۰۲۲ء کو شائع ہوا، اس میں انھوں نے ہارون الرشید کے مستقل کالم "ناتمام" میں در آنے والے شعری مغالطوں اور عروضی اغلاط کی نشان دہی کرتے ہوئے اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ ہمارے کالم نگار اشعار کے اندراج میں متنی اغلاط کے ساتھ ساتھ ماخذات کے ضمن میں بھی عدم توجہی برتتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ عام قارئینِ ادب کا شعری ذوق اس سطح کا نہیں کہ وہ ان اغلاط کو سمجھ سکیں مگر ایسا بھی نہیں کہ متن شناس طبقہ یک سر ختم ہو گیا ہے۔ ان اغلاط سے باذوق طبائع بدمزہ ہوتی ہے، دوسری طرف یہ بھی احتمال ہوتا ہے کہ ناشناس اور کم کوش قارئین کالم نگار پہ اعتماد کرتے ہوئے اس کی تشہیرِ عام کا باعث بنیں۔ خواجہ زکریا خود شاعر اور اعلیٰ درجے کے متن شناس ہیں۔ وہ اپنے کالمز میں موضوع کی مناسبت سے بے تکلف اشعار درج کرتے ہیں مگر صحتِ متن کے ساتھ وہ پروف خوانی پہ بھی خصوصی توجہ دیتے ہیں۔

خواجہ زکریا اردو زبان و ادب کے معروف استاد ہیں اور ان کا تدریسی تجربہ قریب چھے دہائیوں پر مشتمل ہے۔ انھیں مقامی طلبہ کے ساتھ ساتھ دیگر ممالک کے طلبہ کو پڑھانے کا بھی وسیع تجربہ حاصل ہے۔ انھوں نے بیرونی طلبہ کے لیے "اردو فار بگنرز" کے عنوان سے ایک آسان کتاب بھی مرتّب کی جو اردو زبان سیکھنے کے حوالے سے بے حد مفید سمجھی جاتی ہے۔ اردو زبان کے بنیادی مزاج، اس کے آغاز و ارتقاء، قومی زبان کی اہمیت و افادیت اور تدریسِ زبان جیسے پیچیدہ اور دقیق موضوعات پہ ان کی گہری نظر رہی ہے۔ اس حوالے سے وہ ایک واضح نقطۂ نظر رکھتے ہیں جس کا اظہار وہ اپنی تحریروں اور مکالموں میں بھی کرتے رہتے ہیں۔ اخبارات میں لکھے جانے والے کالمز کا اپنا حلقہ اثر ہوتا ہے اور یہ عام قارئین کے ساتھ ساتھ دربار سرکار میں بھی دیکھا جاتا ہے اس لیے خواجہ زکریا نے اپنے کالمز کے ذریعے جملہ طبقات کو اس سنجیدہ مسئلے کی طرف متوجہ کیا۔ اس حوالے سے ان کا ایک کالم "پاکستان میں تدریسِ زبان اور ذریعہ تعلیم کا مسئلہ" بے حد اہم ہے جو دو اقساط میں شائع ہوا۔

پاکستان کی دفتری زبان آج بھی اردو ہے اور خواجہ صاحب کا تجربہ و مشاہدہ درست طور پہ بتاتا ہے کہ کلرک بابو درست انگریزی لکھنے کی قابلیت سے محروم ہیں، دوسری طرف پڑھے لکھے اور سند یافتہ نوجوان اردو زبان بھی لکھنا نہیں جانتے، ان کے بعد مقامی زبانیں یا بولیاں آتی ہیں جنھیں فی زمانہ Mother Tongue کو Native Tongue کہنے کا چلن ہے۔ خواجہ صاحب پاکستان کے تعلیمی اداروں میں ذریعہ تعلیم جیسا اہم سوال اٹھاتے ہیں۔ وہ ابتدائی درجوں میں تعلیم بذیعہ دینے کے ہر گز قائل نہیں اور سمجھتے ہیں کہ ماضی میں کیے گئے ایسے سب تجربات ناکام ہوئے ہیں، حکمران عارضی اور ڈنگ ٹپاؤ پالیسیاں بناتے ہیں، نہ

وہ سنجیدگی سے غور و فکر کا نتیجہ ہوتی ہیں نہ ان کا تسلسل قائم رہا ہے۔

خواجہ زکریا کے کالم ایک ادیب کے کالم محسوس ہوتے ہیں۔ ان کے موضوعات اور اسلوبِ تحریر دونوں میں ادبی رنگ موجود ہے۔ بعض کالمز کا اسلوب اتنے دل کش ہے کہ ان پہ اعلیٰ درجے کے انشائیے کا گمان ہوتا ہے۔ شاعری کی طرح ان کے کالمز میں بھی طنز کا حربہ بہت مہارت سے استعمال کیا گیا ہے۔ ان کا اسلوبِ بیان سادہ مگر ادبی چاشنی سے مزیّن ہے، اسی لیے دوسری تحریروں کی طرح ان کے کالم بھی بے حد خواندنی (Readable) ہیں۔ خواجہ صاحب غیر ضروری تمہیدی پس منظر سے اجتناب کرتے ہیں اور اصل موضوع پہ توجہ مرکوز رکھتے ہیں، بعینہ وہ غیر ضروری حوالہ جات اور غیر مفید معلومات کی فراہمی سے بھی گریز کرتے ہیں۔ ثقیل ادبی الفاظ و تراکیب اور اصطلاحات کا استعمال ان کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا۔ خواجہ صاحب کا شعری ذوق اعلیٰ درجے کا ہے، انھیں بلا مبالغہ ہزاروں اشعار یاد ہیں اس لیے وہ موقع محل کی مناسبت سے شعری امثال پیش کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ وہ جب کسی موضوع کے حق میں شعری اسناد لاتے ہیں تو وہ تحریر کا بنیادی جز بن جاتا ہے اور نگینے کی طرح جڑا محسوس ہوتا ہے۔ اردو کے جن شعراء کے اشعار ان کے کالمز کی زینت بنتے رہے ہیں ان میں میر، غالب، حالی، اکبر، یگانہ، شاد، جالب، فیض، فراق اور ساحر کے نام خصوصیت سے لیے جاسکتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، کہتا ہوں سچ، (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۲۴ء)، ۱۱۔

(۲) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، بحوالہ کالم "صادق جذبوں طیّب رزقوں والے"، مشمولہ: روزنامہ نوائے وقت (لاہور، ۲۷ جون۔ ۲۰۲۱ء)، (ادارتی صفحہ)۔

(۳) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، بحوالہ کالم "اکبر الہ آبادی: ہمارے قومی امراض کے بناض"، مشمولہ: روزنامہ نوائے وقت، (لاہور: یکم جنوری ۲۰۲۳ء)، ادارتی صفحہ۔

(۴) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، بحوالہ کالم "ناظر حسن زیدی: بے مثال حافظے کا مالک"، مشمولہ: روزنامہ نوائے وقت، (لاہور: ۲۲ مئی، ۲۰۲۲ء)، ادارتی صفحہ۔

(۵) ایضاً۔

(۶) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، " ڈاکٹر سیّد نذیر احمد: جنھیں بھلانا ممکن نہیں"، مشمولہ: روزنامہ نوائے وقت، (لاہور: ۱۰۔ اپریل ۲۰۲۲ء)، ادارتی صفحہ۔

(۷) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ”سیّد عابد علی عابد: ایک ٹریجیڈی ہیرو“، مشمولہ: روز نامہ نوائے وقت، (لاہور: ۰۲ مئی ۲۰۲۲ء)، (ادارتی صفحہ)۔

(۸) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ”اورینٹل کالج کی بعض نام ور شخصیات“، مشمولہ: روزنامہ نوائے وقت، (لاہور: ۲۴۔اپریل ۲۰۲۲ء، (ادارتی صفحہ)۔

(۹) ایضاً۔

(۱۰) ایضاً۔

(۱۱) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ”ن م راشد اور مجید امجد کی سرکاری سرپرستی“، مشمولہ: روزنامہ نوائے وقت، (لاہور: ۲۷ مارچ ۲۰۲۲ء، (ادارتی صفحہ)۔

(۱۲) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ”طارق محمود کا حلقۂ دام خیال“، مشمولہ: روزنامہ نوائے وقت، (لاہور: ۱۷ جولائی ۲۰۲۲ء)، (ادارتی صفحہ)۔

References

(1) Dr. Khawaja Muhammad Zakaria, *kehta hoon Such*, (Lahore: Al-Hamd Publications, 2024), p.11

(2) Dr. Khawaja Muhammad Zakaria, Reference by “Sadiq Jazbun Tayyab Razqun waly”, (Incl.) *Daily Nawa-i-waqt*, (Lahore: 27 June 2021)

(3) Dr. Khawaja Muhammad Zakaria, Reference by “Sadiq Jazbun Tayyab Razqun waly”, (Incl.) *Daily Nawa-i-waqt*, (Lahore: 27 June 2021)

(4) Dr. Khawaja Muhammad Zakaria, Reference by “Nazir Hasan Zaidi: Bay Misal Hafzay ka malik”, (Incl.) *Daily Nawa-i-waqt*, (Lahore: 22 May 2022)

(5) ibid.

(6) Dr. Khawaja Muhammad Zakaria, Reference by “Dr. Syed Nazeer Ahmad: Jinhain Bhulana Mumkin nahin”, (Incl.) *Daily Nawa-i-waqt*, (Lahore: 10 April 2022)

(7) Dr. Khawaja Muhammad Zakaria, Reference by “Syed Abid Ali Abid: Aik Tragedy Hero”, (Incl.) *Daily Nawa-i-waqt*, (Lahore: 20 May 2021)

(8) Dr. Khawaja Muhammad Zakaria, Reference by “Oriental College Ki Namwar Shakhsiyat: ”, (Incl.) *Daily Nawa-i-waqt*, (Lahore: 24 April 2021)

(9) ibid.

(10) ibid.

(11) Dr. Khawaja Muhammad Zakaria, Reference by “Noon Meem Rashid aur Majeed Amjad ki Sarkari Sarparasty”, (Incl.) *Daily Nawa-i-waqt*, (Lahore: 27 March 2022)

(12) Dr. Khawaja Muhammad Zakaria, Reference by “Tariq Mehmood ka Halkay’e Daam Khayal”, (Incl.) *Daily Nawa-i-waqt*, (Lahore: 17 March 2022)

❖❖❖